بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

حال ہی میں پاکستان میں ایک کتابچہ سویٹ یونین اور اسلام بزبان انگریزی بہ سیع پیمانے پر تقسیم کیا گیا ہے۔ کتابچے کے لکھنے والے کمیونسٹ پارٹی ازبکستان کی مرکزی کمیٹی کے سابق سکرٹری مسٹر آر۔ این نشانوو (R.N. NISHANOV) ہیں جو اب سیلون میں روس کی طرف سے بطور سفیر تعینات ہیں۔ صاحبِ موصوف چونکہ ایک طویل عرصہ تک ازبکستان کی کمیونسٹ پارٹی کی ایک کلیدی اسامی پر فائز رہے ہیں اس لیے انہیں اس خطّے کے مسلمانوں کے رجحانات اور اُن کے بچے کھچے مذہبی جذبات و احساسات سے گہری واقفیت نظر آتی ہے۔ پھر چونکہ وہ اپنے آپ کو کمیونزم کا سچّا اور مخلص علمبردار ثابت کرنے کیلیے بھی شدید خواہشمند نظر آتے ہیں اس لیے روس کی مسلم ریاستوں میں "اسلامیت" کا کوئی نشان پا کر انہیں دلی قلق محسوس ہوتا ہے اور وہ اسے اشتراکیت کے لیے عظیم خطرہ تصور کرتے ہوئے مسلم معاشرے میں اسلام کے ایک۔ ایک نشان کو مٹانے اور مسلمانوں کو سو فیصد کمیونزم کا پرستار بنانے کے لیے وہ بعض بڑی مؤثر تجاویز پیش کرتے ہیں۔

مسٹر نشانوو نے رُوسی مسلمانوں اور اس ضمن میں پُوری دنیائے اسلام کے حالات کا جو تجزیہ پیش کیا ہے اُس سے اُن کے مشاہدے کی گہرائی اور مطالعے کی وسعت کا ضرور اندازہ ہوتا ہے۔ پھر چونکہ وہ اس وقت سیلون میں ایک اہم عہدے پر فائز ہیں اس لیے انہیں بھارت اور پاکستان کے مسائل سے گہری دلچسپی نظر آتی ہے اور وہ ایک کمیونسٹ کے نقطۂ نظر سے ان پر غور کرتے ہیں۔ اس کتابچے کو انہوں نے تین حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلام معاذاللہ ایک بوسیدہ مذہب اور قرآن مجید ایک ایسی بوسیدہ کتاب ہے جس سے معاشرے کے کمزور طبقوں کا

استحصال کرنے والوں کو رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ اسلام چند غیر عقلی توہمات سے عبارت ہے اس میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو دانش کو اپیل کرے۔ اس مذہب نے ہمیشہ کمزور طبقوں کو دبانے اور برباد کرنے میں طاقتور طبقوں کے ہاتھ میں ایک ہتھیار کے طور پر کام دیا ہے۔ جنت و دوزخ، حشر و نشر سب اعتباری باتیں ہیں جن کا مقصد سادہ لوح عوام کو محض فریب دینا ہے۔

سب سے پہلے اسلام کی "تعریف" سنیے۔

"اسلام دنیا کا غیر علمی رجعت پسندانہ تصور ہے جو مارکس لینن کے علمی تصور سے متصادم ہے۔ اسلام (اشتراکیت) کی رجائیت پسندانہ اور حیات آفریں مادی تعلیمات کے بالکل مخالف ہے اور سوویٹ یونین کے باشندوں کے مفادات سے مغائرت رکھتا ہے۔ یہ مسلمانوں کو اشتراکی معاشرہ کی تعمیر میں مؤثر کردار ادا کرنے میں مزاحم ہوتا ہے۔

قرآن مجید خلیفہ کے ہمنوا جاگیرداروں اور بڑے بڑے تاجروں کو خوش کرنے کے لیے تصنیف کیا گیا، اس میں جنت و دوزخ کے جو قصے درج ہیں ان کا مقصد مزدوروں کو بے بس غلاموں میں تبدیل کرنا ہے۔ مسلمانوں کے مقدس تہوار خصوصاً عید الاضحیٰ اور صیام رمضان اس دور کے باقیات ہیں جب انسان اس امر کا یقین رکھتا تھا کہ وہ جادو کے ذریعے دیوتاؤں اور بد روحوں کو خوش کر سکتا ہے۔ حج عرب کے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی آمدنی کا ایک ذریعہ ہے اور اب استعمار پسند حج کے موسم کو جاسوسوں اور انتشار پسندوں کی بھرتی کرنے کیلیے ایک اچھا موقع تصور کرتے ہوئے اس سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں۔ قرآن و سنت کی تعلیمات دنیا کی ساخت اور اس کے وجود کے بارے میں قدرت کی کرشمہ سازیوں کے متعلق نہایت گمراہ کن نظریات پیش کرتی ہیں ..... قرآن قوانین فطرت اور قوانین معاشرت کی نفی کرتا ہے اور ان کی جگہ اس اصول کا پرچار کرتا ہے، "خدا اپنی منشاء کے مطابق کائنات کو پیدا کرتا اور اپنی خواہش کے مطابق اسے چلاتا ہے۔

(اس طرز فکر سے) یہ حقیقت خود بخود منکشف ہو جاتی ہے کہ قرآن کے مصنفین اس چیز سے بے خبر تھے کہ مظاہر قدرت کے درمیان کوئی رابطہ نہیں ہے۔ اسلامی نقطۂ نگاہ جسے خدا کی مرضی کہا جاتا ہے وہ فطری ربط و ضبط ہے ..... جس وقت

قرآن تصنیف کیا جا رہا تھا، نہ صرف اس کے مصنفین بلکہ اس کے مخاطب بھی مظاہرِ قدرت کے بارے میں بہت کم واقفیت رکھتے تھے اور جو چیز اُن کی سمجھ میں نہ آتی تھی اس کے متعلق یہ کہتے کہ یہ خدا کی طرف سے ہے۔ اینجل نے کہا ہے: اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ میں ناقابلِ ادراک مظاہرِ قدرت کو حادثہ کا نام دوں یا خدا کا۔ یہ دونوں نام میری کم علمی کے مظہر ہیں اور ان کا علم سے کوئی دُور کا بھی تعلق نہیں۔ جہاں (علت و معلول) کی کڑیاں مفقود ہوں وہاں علم کے وجود کا کس طرح تصور کیا جا سکتا ہے۔" (ص ۹-۱۱)

اسی موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے مصنف اسلام اور سائنس کے درمیان کسی سمجھوتے کو بالکل ناممکن سمجھتا ہے اور جو لوگ اس قسم کی کوششوں میں مصروف ہیں انہیں دیوانہ خیال کرتا ہے کیونکہ اس کے نزدیک سائنس انسان کی شعوری قوتوں کو بیدار کرتی ہے جبکہ مذہب انسان کے ذہن کو تاریک بناتا اور اسے فطرت کی قوتوں کے سامنے بے بس ہو کر زندگی بسر کرنے کی تلقین کرتا ہے اس سے اس کی تخلیقی جدوجہد میں کمی آتی ہے۔ ص ۱۱

پھر مصنف کو اسلام سے یہ بھی شکایت ہے کہ وہ مسلمانوں کو ماضی کی طرف رجوع کرنے کا درس دیتا ہے اور انہیں یہ بتاتا ہے کہ اُن کی تاریخ کا روشن دور ماضی میں ہے۔ اسی سلسلے میں وہ اُس گہوارۂ جنت کا بھی مذاق اڑاتا ہے جس میں سب سے پہلے حضرت آدمؑ اور حوا کو رکھا گیا یعنی تخلیقِ انسان کے اس سب سے اہم واقعہ کو ایک لغو قصے سے تعبیر کرتا ہے۔ مسٹر نشانوو کے الفاظ میں مسلمانوں کی اس ماضی پرستی کے نقصانات یہ ہیں:

"اسلام کے "سنہری زمانہ" کے تصور نے کرۂ ارضی پر تنظیمِ نو کے لیے جدوجہد کو کافی صدمہ پہنچایا ہے۔ یہ تو درحقیقت غلامی، بے بسی اور انسانی محنت کی فتح و کامرانی میں بے یقینی کا ایک وعظ ہے۔" ص ۱۲

قرآنِ حکیم اور اُس کی تعلیمات سے سرسری واقفیت رکھنے والا شخص بھی یہ جانتا ہے کہ اس

کتابِ الٰہی نے انسانی عزّ و شرف کا جس قدر پرچار کیا ہے وہ دنیا کی کسی دوسری کتاب میں نہیں ملتا۔ اس نے انسان کو اُس کے بلند مرتبہ سے آگاہ کیا اور اُسے بتایا کہ وہ اس زمین پر خدا کا نائب ہے اور ساری کائنات اُسی کی خدمت اور چاکری کے لیے پیدا کی گئی ہے مگر یہ عجیب المیہ ہے کہ کتابچہ کے فاضل مصنف کو قرآن مجید میں انسان کی تذلیل کے سوا کوئی دوسری چیز نظر نہیں آئی۔

"قرآن انسان کے عزّ و شرف، اُس کے ذہن، اس کی عظمت اور اُس کی تخلیقی قوتوں کے بے پایاں ممکنات کو کم کرتا ہے۔ قرآن کی رُو سے انسان خواہ کتنی ہی محنت کرے وہ کوئی اچھی چیز پیدا نہیں کر سکتا۔ قرآن دنیوی زندگی اور انسان کے معاملات کو محض طفل تسلی اور جھوٹی شان و شوکت سے تعبیر کرتا ہے۔"

اِس تمہید کے بعد مصنف قرآن مجید سے اُن آیات کو نقل کرتا ہے جن میں آخرت کی ابدی زندگی کے مقابلے میں دنیا کی چند روزہ زندگی کی بے وقعتی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اور اس کے بعد ان آیات سے بالکل غلط نتائج اخذ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"اگر ہم قرآن پر اعتماد کریں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا اصل غرض اجتماعی اعتبار سے مفید محنت کرنا یا مختلف ممالک کے عوام کے دوش بدوش کھڑے ہو کر بہتر اور شادکام زندگی کے حصول کے لیے جدوجہد کرنا نہیں جس سے قومی اور معاشرتی استبداد کا خاتمہ ہو بلکہ قرآن کی تعلیمات کی رُو سے انسان کا فرض یہ ہے کہ وہ صبر کے ساتھ مصائب یعنی استحصال کرنے والوں کے ظلم و ستم کو برداشت کرے ——— اور قرآن اُن کی توجہ معدوم جنت میں اخروی فلاح کی طرف مبذول کراتا ہے۔ یہ سماج دشمن اور عوام دشمن سرگرمیاں ہیں۔ ان کا مقصد مزدوروں کو معاشرہ کی تنظیمِ نو کے لیے طبقاتی جدوجہد سے الگ رکھنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رجعت پسندانہ حکومتیں اسلام کی حمایت پر کمر بستہ ہوتی ہیں۔

اسلام ایک طبقاتی معاشرے کا مذہب ہے اس میں جنت کا عقیدہ استحصال کرنے والوں کے حقوق کی پاسبانی کرتا ہے۔ قرآن مومنوں کو جنت میں ٹھنڈک آسودگی اور سیاہ پلکوں والی حوروں کی بشارت دیتا اور اسے فوزِ عظیم قرار دیتا ہے۔ حیات

بعد ممات کی جس قدر تعلیمات ہمیں قرآن میں ملتی ہیں اور مسلمانوں کو جنت میں نوازشات کے جس قدر وعدے کیے گئے ہیں یہ سب ایک ایسے سماج کے تصورات ہیں جس میں استحصال کا دور دورہ ہو۔ قرآن اس استحصال کو قدرتی امر خیال کرتا ہے اور اس بات کا دعویدار ہے کہ انسانی طبقاتی استبداد، غلامی کو خود خدا نے قائم کیا ہے۔" ... ص ۱۵

مُصنف سورۃ الزخرف کی آیت ۳۲ کا غلط ترجمہ درج کر کے اپنی طرف سے یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے:

"قرآن کی رُو سے اسلام ایک ایسے مذہب کی نمائندگی کرتا ہے جو استحصال کرنے والوں کا مؤید ہے۔ ذاتی ملکیت اور معاشی ناانصافی کو قرآن تحفظ دیتا اور ان دونوں کو وہ رحمتِ الٰہی سے تعبیر کرتا ہے ... قرآن غریبوں اور بیکسوں کو اس بات سے ڈراتا ہے کہ امراء کی جائداد کے خلاف کوئی کوشش کر کے اپنے مصائب کو بدلنے کی جدوجہد کریں ... اس طرح غربت و افلاس، شدید انسانی مصائب، معاشرتی ناانصافی اور غلامی قرآن حکیم کی رُو سے خدا کی نظر میں پسندیدہ اعمال ہیں۔" ص ۱۵-۱۶

مسٹر لشانود کو اس بات سے بھی سخت کرب و اضطراب محسوس ہوتا ہے کہ اُس نے عقیدہ کی بنیاد پر انسانیت کی شیرازہ بندی کی ہے۔ اُس نے نوعِ بشری کو امیر اور غریب کے درمیان تقسیم کرنے کے بجائے کفر و اسلام کی بنیاد پر تقسیم کیا ہے۔ اسلام کے ماننے والے خواہ کسی ملک، کسی نسل اور کسی طبقے سے تعلق رکھتے ہوں، ایک برادری کے افراد ہیں جسے قرآن حکیم نے امتِ وسط کہا ہے اور خدا اور رسول کا انکار کرنے والے خواہ وہ کسی رنگ اور نسل کے ہوں اسلامی نقطۂ نظر سے ایک قوم ہیں

چشمِ فلک نے آج تک انسانیت کی شیرازہ بندی کی اس سے بہتر کوئی دوسری بنیاد نہیں دیکھی کہ نیکی، پاکبازی، خدا خوفی ایک طرف ہو اور کفر و ضلالت اور شر و فساد دوسری طرف ہو۔ اس ایک بنیاد کے علاوہ ہر دوسری بنیاد باطل ہے۔

اشتراکیت کی نظر میں یہی بنیاد سب سے زیادہ غلط اور قابلِ نفرت ہے۔ وہ انسانیت کو غربت اور امارت کی بنیاد پر دو گروہوں میں تقسیم کرنا چاہتی ہے۔ مسٹر لشانود نے مختلف مقامات پر اس بات کا رونا رویا ہے کہ مسلمان قومیت کے اس آفاقی تصور سے ابھی تک ناآشنا نہیں ہوئے، اُن کے تحت الشعور میں

عقیدے کی بنیاد پر ملت کی شیرازہ بندی کا تخیل آب وتاب کے ساتھ موجود ہے۔ مسٹر لشانوو کے الفاظ میں اس تخیل سے استحصال پسندوں نے خوب فائدہ اٹھایا ہے۔ پاکستان کے وجود کو بھی مصنف اسی رجعت پسندانہ تصور کا ایک مظہر خیال کرتا ہے۔

"اسلام نے مختلف مذاہب کے پیروؤں کے مابین نفرت کے جو بیج بوئے ہیں اُسے استحصال کرنے والوں نے مشرق میں قومی آزادی کی تحریکوں کو کمزور کرنے کے لیے خوب استعمال کیا ہے۔ مثال کے طور پر ۱۹۴۷ء میں برطانوی استعمار پسندوں نے مذہب کی اساس پر بھارت اور پاکستان کی تقسیم کر دی" ص ۱۰-۹

مسٹر لشانوو اس بات سے بھی سخت برہم ہیں کہ قرآن مسلمانوں کو آپس میں اخوت اور بھائی چارہ قائم کرنے کی ترغیب دیتا ہے اور اسطرح انہیں طبقاتی کشمکش سے الگ کر کے غریبوں کے حقوق پامال کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ اس ضمن میں مصنف نے قرآن مجید کی آیات اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات کی اس شرمناک انداز میں تحریف کی ہے کہ انسان حیرت زدہ ہو کر یہ سوچنے لگتا ہے کہ کیا کوئی علم کا دعویدار پستی کی اس سطح تک بھی جا سکتا ہے۔ ہم یہاں اس کی صرف ایک مثال پیش کرتے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مشہور فرمان ہے کہ اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ اس فرمان کے ساتھ احادیث میں یہ تصریح بھی موجود ہے کہ اس پر حضور کے جاں نثاروں نے آپ سے یہ بھی دریافت فرمایا کہ حضور مظلوم کی مدد کا معاملہ تو سمجھ میں آتا ہے مگر ظالم کی امداد سمجھ میں نہیں آتی۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا: ظالم کی مدد یہ ہے کہ اُسے ظلم کرنے سے باز رکھو۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد اور یہ تصریح احادیث کے قریب قریب سارے مجموعوں میں موجود ہے مگر لشانوو کی بددیانتی ملاحظہ ہو کہ اُس نے حدیث کے صرف پہلے ٹکڑے کو درج کیا ہے، یعنی مدد کرو اپنے مسلمان بھائی کی خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم" دوسرے حصے کے متعلق وہ یہ کہتا ہے کہ جن لوگوں نے یہ الفاظ تصنیف کیے انہیں خود بھی ان کے سماج دشمن ہونے کا احساس ہوا اور انہوں نے بعد کے الفاظ شامل کر دیے مگر ان کا مدعا اس کے سوا کچھ نہیں کہ لوگوں کو طبقاتی کشمکش، جو معاشرتی اور قومی حقوق کے تحفظ کے لیے برپا کی جاتی ہے، باز رکھا جاتے اور اس طرح انہیں استحصال پسندوں، نو آبادکاروں کے سامنے سرنگوں رہنے کی تعلیم دی جاتے اور انہیں ہمیشہ غلامی، افلاس اور بھوک کو برداشت کرنے پر آمادہ کیا جاتے۔

مسٹر لشانوو نے اس بات پر ماتم کیا ہے کہ مسلمان عہد جدید میں قومیت کے اس تصور کو زندہ کرنے اور زندہ رکھنے

کی کوشش کر رہے ہیں اور مارکس کے کیپٹل کے بجائے قرآن مجید کو اپنانے کی تلقین کرتے ہیں۔

اس سلسلے میں مصنف اُن لوگوں کی کوششوں کو بھی بڑی تشویش کی نگاہ سے دیکھتا ہے جو اسلام اور اشتراکیت کے درمیان پیوند کاری میں مصروف ہیں یا اسلامی تعلیمات کو اشتراکی تعلیمات کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے تگ و دو کر رہے ہیں۔ وہ اس قسم کی کوششوں کو بالکل لغو قرار دیتا ہے کیونکہ اسلام اور اشتراکیت کے مابین کوئی ایک چیز بھی ایسی نہیں جسے قدرِ مشترک کہا جا سکے، اس لیے جو لوگ ان کے درمیان ملاپ کرانے کے آرزومند ہیں وہ مسٹر لشانوو کی نظر میں اشتراکیت کی راہ کھوٹی کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں اُن کا نقطۂ نظر ملاحظہ ہو:

> "قرآن کے اخلاقی اور قانونی ضابطے اور اس کا نظامِ شریعت جس طرح کہ اس نے طبقاتی معاشرہ میں نشوونما پائی ہے، استحصال پسندوں کے مفادات کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس نظام کا حقیقی انسانیت پرستی سے کوئی دُور کا تعلق نہیں۔ وہ انسانیت پرستی جو کہ اشتراکیت کے معماروں کے ہاں ملتی ہے جو ایسے اخلاقی اصولوں سے عبارت ہے جن کی بنا پر عوام کے تعلقات باہمی عزت و احترام پر استوار ہوتے ہیں اور جن کی وجہ سے سوویٹ یونین کے عوام کے مابین دوستی اور اخوت کا قیام عمل میں لایا جاتا ہے۔" ص ۲۴-۲۵

مصنف کو اس بات سے تو کسی قدر خوشی محسوس ہوتی ہے کہ سوویٹ یونین کا مسلمان اپنی مذہبی روایات کو خیرباد کہہ رہا ہے مگر اُسے یہ دیکھ کر دکھ بھی ہوتا ہے کہ وہ پُورے طور پر اشتراکی بننے میں متامل نظر آتے ہیں۔ ان مسلمانوں کا ایک اچھا خاصا حصّہ اس بات کا متمنی ہے کہ وہ اسلام کے ساتھ کسی نہ کسی طرح وابستہ رہے۔ اس لیے وہ مختلف تاویلات کے ذریعے اسلام اور اشتراکیت کو ایک دوسرے کے ساتھ ہم عنان رکھنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے رہتے ہیں۔ مُصنف اس نعرے "کلّ مسلمٍ اخوۃ" میں ایک عظیم خطرہ محسوس کرتا ہے اور مسلمانوں کے اندر اس نعرے کو رواج دینے کا حامی ہے: "مسلمان ایک دوسرے کے کامریڈ ہیں۔ اس کا خیال یہ ہے کہ اخوت کے لفظ سے ذہن شعوری اور غیر شعوری طور پر اسلام کے تصورِ ملت کی طرف پلٹتا ہے اور کامریڈ کے لفظ کے استعمال سے مسلمانوں میں اشتراکی تصورِ قومیت

کو قوت فراہم ہوتی ہے۔ مسٹر نشانووجہاں کہیں بھی اسلامی بیداری کا کوئی معمولی نشان بھی پاتے ہیں تو انہیں سخت اذیت پہنچتی ہے۔ مثال کے طور پر انہیں جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ سوویٹ مسلمانوں کے اندر قرآن مجید کے پڑھنے کا رجحان پھر سے پیدا ہو رہا ہے یا وہ اپنی روح کی تسکین کے لیے از سرِ نو مذہبی رسُوم ادا کرنے لگے ہیں تو وہ چونک پڑتے ہیں اور اشتراکیت کے علمبرداروں کو کسی بہت بڑے خطرے کی دہائی دیتے ہیں۔ انہیں اسلام کے تصورِ خدا میں ایک آمر کی روح نظر آتی ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ اس تصور کے رواج پانے سے جاگیرداری اور سرمایہ داری کا زور بڑھے گا۔ انہیں اس بات سے بھی خدشہ لاحق ہوتا ہے کہ مسلم معاشرے میں ابھی علماء کا وقار باقی ہے۔ اور لوگ اپنی معاشرتی زندگی خصوصاً شادی بیاہ کے معاملات میں اُن کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

ان سب باتوں کو بیان کرنے کے بعد مسٹر نشانووا اپنی پُوری توجہ رُوسی مسلمانوں کی طرف مبذول کرتا ہے۔ وہ اس بات کو پُوری طرح ذہن نشین رکھ کر اپنی بات آگے بڑھاتا ہے کہ صدیوں پُرانی روایات جو مسلم معاشرے میں اپنی جڑیں دُور دُور تک پھیلا چکی ہیں اور صدیوں پُرانے اعتقادات جو مسلمانوں کے قلب و دماغ میں اچھی طرح پیوست ہو چکے ہیں انہیں بیخ و بُن سے اکھاڑنا کوئی سہل اور آسان کام نہیں اس کے لیے بڑی حکمت و دانائی اور تدبر کی ضرورت ہے۔ اِس ضمن میں سوویٹ حکومت کو اچھی خاصی کامیابی حاصل ہوئی ہے لیکن افسوس کہ مسلمان ابھی تک اشتراکیت کے صحیح معنوں میں پرستار نہیں بن سکے۔ ان کے خیالات ان کی مذہبی رسومات، اُن کے معاشرتی اداروں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں ابھی تک دین کی کچھ دبی چنگاریاں موجود ہیں جو ذرا سی ہوا دینے سے فوراً بھڑک سکتی ہیں۔ اس لیے سوویٹ حکومت کے یہ سچے خیر خواہ سب سے پہلے اُن اسباب کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن کی وجہ سے مذہب کی کچھ چنگاریاں باقی رہ گئی ہیں اور پھر اُن تدابیر کا ذکر کرتے ہیں جن سے انہیں بالکل راکھ بنایا جا سکتا ہے۔

مسٹر نشانو دسب سے پہلے زار روس کی کوتاہی بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اُس نے مسلم علاقوں کو روسی نوآبادیوں میں تبدیل کرنے میں بڑی ہمت کا ثبوت دیا مگر اُس نے حماقت یہ کی کہ اسلام سے کوئی تعرض نہ کیا بلکہ مسجد کی حمایت کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ "مُلّا" کو مسلم معاشرے میں کافی حد تک بالا دستی حاصل رہی اور اس طرح

کوئی ہمہ گیر انقلاب پُوری کامیابی کے ساتھ برپا نہ کیا جا سکا۔

پھر اشتراکیت کے ان علمبرداروں سے دوسری فروگزاشت یہ ہوئی کہ وہ قومی رسومات اور روایات کو مذہبی اثرات سے دانشمندی کے ساتھ بچانے میں کامیاب نہ ہوئے۔ مسلمانوں کے قومی تہواروں اور اداروں پر اسلام کی چھاپ کسی نہ کسی صورت میں باقی رہی۔ مسٹر نشانوو کے خیال کے مطابق مسلمانوں کو پُوری طرح ملحد بنانے کے لیے یہ ضروری تھا کہ ایسے انتظامات کیے جاتے جن سے لوگ دینِ حق سے برگشتہ ہوتے اور دینِ اشتراکیت کو دل کی گہرائیوں سے قبول کرتے۔ اس ضمن میں جتنی تدابیر بھی کی گئیں ان میں سے بعض انہیں بُری پسند ہیں، مثلاً اپریل ۱۹۲۳ء کے ماہِ صیام میں ایک ایسا پروگرام ترتیب دیا گیا جس سے عوام کے ذہنوں میں اس مقدس مہینے کی عظمت ختم ہو اور مسلمان اپنے خالق کی طرف رجوع کرنے اور تزکیۂ نفس کی تربیت حاصل کرنے کے بجائے خدا کے باغی اور نفس کے بندے بن سکیں۔ اس پروگرام کی تفصیل ذرا مصنف کی زبان سے ملاحظہ فرمائیں:

"اپریل ۱۹۲۳ء میں شہری اور علاقائی پارٹی کی کمیٹیوں نے پارٹی کی ساری ابتدائی تنظیموں کو مذہب کے خلاف پروپیگنڈے کے لیے پُوری طرح استعمال کیا۔ خصوصاً ماہِ رمضان میں ان سے خوب کام لیا گیا۔ اس ماہ کے آغاز سے پہلے غریب کسانوں کے اشتراک سے نہایت خوبصورت قہوہ خانے قائم کیے گئے۔ چنانچہ اس کا اثر یہ ہوا کہ اس مہینے میں لوگ قہوہ خانوں میں جاتے، وہاں مختلف قسم کی مجالس منعقد ہوتیں جن میں اہم سیاسی اور معاشی اور مقامی معاملات زیرِ بحث آتے۔ ان مجالس میں تجربہ کار انقلابی نہایت دلچسپ انداز میں سامعین سے خطاب کرتے۔

مسٹر نشانوو کے خیال کے مطابق چونکہ مسلمانوں کو پُوری طرح اشتراکی بنانے میں کئی قسم کی کوتاہیاں ہوئی ہیں اس لیے وہ سو فیصد ملحد اور زندیق نہیں بنے۔ اُن کے معاشرے میں ابھی تک کچھ علامات ایسی موجود ہیں جن سے رجعت پسندی کا اظہار ہوتا ہے۔ مصنف کو سب سے بڑا دکھ اس بات کا ہے کہ ابھی تک "ملّا" پُوری طرح درست نہیں ہوا اور وہ حکومت کی شدید مذہب دشمن پالیسی کے باوجود ان علامات" کی حفاظت کر رہا ہے۔ اس سلسلے میں ذرا ان کے اضطراب کا اندازہ لگائیں:

"بعض مسلمان علاقوں میں ایک شخص اکثر اوقات شادی بیاہ، بچے کی پیدائش اور موت پر مذہبی رسومات کو دیکھتا ہے" ص۲۴

پھر مصنف کو سب سے زیادہ کوفت اس بات سے ہوتی ہے کہ ان مذہبی روایات کو صرف جاہل عوام ہی سینے سے نہیں لگا رہے بلکہ بعض اوقات بڑے اونچے اور پڑھے لکھے مسلمان بھی انہیں اپنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مصنف کے ارشاد کے مطابق:

"بسا اوقات یوں بھی ہوتا ہے۔ کہ ان مذہبی رسومات کو علمی پیشہ سے تعلق رکھنے والے لوگ بھی ادا کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر مسلم آبادی کے ایک علاقے میں جسے اندیزہان کہا جاتا ہے ۱۹۶۸ء میں جن مسلمانوں نے شریعت کے مطابق نکاح کیا اُن میں سنر کی تعداد میں محکمہ تعلیم سے تعلق رکھنے والے ۶۲ طلبا اور دس ڈاکٹر تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ زبانی طور پر تو سائنٹفک فلسفہ کے حامی ہیں مگر عملی زندگی میں وہ مذہب سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ اشتراکی نظام کو نقصان پہنچاتے ہیں اور ان کا طرزِ عمل عوام کے اذہان پر ضرر رساں اثرات مترتب کرتا ہے۔ ایسی مثالیں بھی موجود ہیں جبکہ بعض اشتراکیوں نے اپنی انفرادی زندگی میں مذہب کے ساتھ ایک صلح پسندانہ روش اختیار کی۔ یعنی مذہبی رہنماؤں کے بتائے ہوئے غیر انسانی افعال کے ساتھ سمجھوتہ کیا اور بعض اوقات انہوں نے مذہبی رسوم بھی ادا کیں۔

اس قسم کی باتوں کا وجود ناقابلِ برداشت ہے چنانچہ ازبکستان کی اشتراکی پارٹی کی مرکزی کمیٹی نے ایسے تمام لوگوں کو سخت سرزنش کی اور جماعت کی جملہ تنظیموں کو حکم دیا کہ وہ کمیونزم سے تعلق رکھنے والوں سے پارٹی کے اصولوں کی بلا چون و چرا پابندی کرنے کا مطالبہ کریں۔

اشتراکیت چونکہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے اس لیے اُسے یہ بات کسی صورت بھی گوارا نہیں کہ مذہب کسی شکل میں بھی اشتراکی معاشرے میں باقی رہے۔ کمیونزم کے سچے خیرخواہوں کو وہ کوششیں بھی کھلتی ہیں جو اشتراکیت کو مشرف بہ اسلام کرنے کے لیے بعض لوگوں نے وقتاً فوقتاً کی ہیں۔ مسٹر لشانود کو اس میں

یہ خطرہ محسوس ہوتا ہے کہ مذہب کو اگر غیر عقلی عناصر سے پاک کر دیا گیا تو اس میں اپنے آپ کو علمی نظریات سے ہم آہنگ کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے گی اور یہ رجحان عوام کو پھر مذہب کا گرویدہ بنا دیگا۔ مسٹر لتسانوو کو اس بات سے بھی کد ہے کہ اسلام نے اخلاق کی جو آفاقی قدریں پیش کی ہیں یعنی امانت دیانت، بزرگوں کا احترام، صبر و استقلال، چوری اور زنا سے پرہیز، اُن کا بھی پرچار کیا جائے کیونکہ اُس کے خیال کے مطابق ان قدروں کے زندہ رہنے سے مذہب کی زندگی میں اضافہ ہونے کا خطرہ ہے۔ مسٹر لتسانوو ان قدروں کے حفظ و بقا کی کوششوں کو ملا کی اشتراکیت کے خلاف گہری سازش سے تعبیر کرتا ہے۔

اس کتابچے کے آخری حصے میں مصنف نے مسلمانوں کو اشتراکیت کے رنگ میں پوری طرح رنگنے کے لیے بعض تجاویز بھی پیش کی ہیں جن کا مطالعہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔

ان کی پہلی تجویز یہ ہے کہ اسلام کی براہِ راست مخالفت نہ کی جائے بلکہ ایسے افکار و نظریات کا پوری کوشش سے پرچار کیا جائے جن کے پھیلنے سے اسلامی تعلیمات بالکل تاریک خیالی بن کر رہ جائیں۔

اس کے ساتھ ساتھ مذہب اور سائنس کے مابین جو عظیم فرق ہے اسے نوجوان نسلوں کے اچھی طرح ذہن نشین کرایا جائے اور انہیں بتایا جائے کہ سائنس کو مذہب سے وہی تعلق ہے جو روشنی کو تاریکی سے ہوتا ہے۔ اس لیے ان دونوں کو بیک وقت کسی طور بھی اپنایا نہیں جا سکتا۔ اگر انسان کو علم کی روشنی مقصود ہے تو پھر اسے مذہب کی جہالتوں سے اپنے آپ کو بچانا پڑے گا۔ چنانچہ جب بھی اشتراکیت کا پرچار اس سائنٹفک انداز میں کیا گیا تو اس سے بڑے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے مثلاً پہلی جنگِ عظیم سے پیشتر سوویٹ یونین میں ۳۵۰۰۰ مساجد تھیں مگر اب ان کی تعداد کم ہو کر صرف چند سو رہ گئی ہے اور ان میں بھی زیادہ تر عبادت کے لیے نہیں بلکہ دوسری تقریبات کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ ان مساجد کے بجائے اب وہاں ہزاروں یونیورسٹیاں اور مدارس قائم ہو چکے ہیں جو شب و روز ملحدانہ تعلیم دینے میں مصروف ہیں۔

مسٹر لتسانوو ان نمایاں کامیابی پر خوش نہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ یہ کام زیادہ وسیع پیمانے پر اور زیادہ منظم طریق سے سرانجام دیا جائے کیونکہ مسلم آبادی کے ایک بہت بڑے حصے نے اشتراکی فلسفہ کو دل و جان سے قبول نہیں کیا۔ اس لیے وہ اپنی نجی زندگی میں اس دین سے کسی نہ کسی طرح وابستہ رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ

(باقی ص ۴۴ پر)

(بقیہ اشارات)

چیز اشتراکی معاشرے کے لیے سمِ قاتل ہے۔ عوام کو اشتراکیت کا صحیح معنوں میں پرستار بنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ زندگی کے صرف ایک شعبے ہی میں اشتراکیت کی برتری قائم نہ کی جائے بلکہ فکر و نظر کے جس قدر گوشے اور عمل کے جس قدر میدان ممکن ہو سکتے ہیں ان سب میں اشتراکیت کی بالادستی قائم کرنے کے لیے کوشش کی جائے تاکہ حیاتِ انسانی کا کوئی شعبہ اور قلب و دماغ کا کوئی ریشہ ایسا نہ رہے جو اشتراکیت کا ترجمان نہ ہو۔ اس کے لیے نظامِ تعلیم اور نشر و اشاعت کے ذرائع کو نئے انداز سے مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔

فاضل مصنف کے نزدیک اشتراکیت کو مسلمانوں میں ایک مؤثر قوت بنانے کے لیے دوسری اہم تدبیر یہ ہے کہ ان کے خاندانی نظام اور ازدواجی زندگی کو اس انداز سے درہم برہم کر دیا جائے کہ اسلام کا کوئی نام و نشان باقی نہ رہے۔ انہیں مسلمان عورت کے اس طرزِ فکر سے خاص طور پر شکایت ہے کہ وہ کوشش کے باوجود ابھی تک شمعِ انجمن بننے سے گریز کرتی ہے۔ اس سلسلے میں ان کے یہ الفاظ بڑی توجہ کے محتاج ہیں:

"مذہبی اقدار کے بقا اور ان کی ترقی کا ایک بڑا سبب عورتوں کا مردوں سے الگ تھلگ رہنے کا رجحان ہے۔ یہ رجحان اس حقیقت کی شہادت فراہم کرتا ہے کہ پرانے خاندانی نظام کے کچھ عناصر ابھی موجود ہیں" (ص۷۳)

اس تذکرے کے بعد وہ اشتراکیت کے علمبرداروں کو ان کی ذمہ داریاں یاد دلاتے ہوئے کہتے ہیں:

"ہمیں عورتوں کو غیر مذہبی تربیت دینے کی طرف خاص توجہ دینی چاہیے اور اس کام کو ان کی خاندانی حیثیت، عمر، تعلیم، قومی روایات اور رواج کو ملحوظِ خاطر رکھ کر سرانجام دینا چاہیے۔ عورتوں میں دل لگا کر کام کیجیے، ان کے اندر جاگیرداری نظام کے جتنے نقوش پائے جاتے ہیں انہیں مٹانے کے لیے جدوجہد کیجیے اور ان کی جگہ نئے طور طریقوں کا پرچار کیجیے۔"

مسلم معاشرے میں اشتراکیت کی سربلندی کے لیے تیسری اہم تدبیر جس کی طرف مسٹر لشانوو نے اشارہ کیا ہے وہ علمی اور تحقیقی کام کے لیے نئے موضوعات کی تلاش ہے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ اشتراکی اہلِ علم مسلمانوں کے مذہبی عقائد کو زیرِ بحث لانے پر اکتفا نہ کریں بلکہ ان تمام موضوعات پر غور و فکر کرنے کی کوشش کریں جو مسلمانوں کی اجتماعی اور معاشرتی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں اور پھر انہیں یہ بتائیں کہ ان کی سماجی زندگی توہم پرستی کا نمونہ ہے جس کا حقیقت سے دور کا بھی تعلق نہیں۔